۹

اسلام میں 'چرچ' کے انہدام کی ضرورت

اسلام میں ہر شخص خود ہی اپنا پوپ ہے اور اسے خود اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ خدا سے راست تعلق قائم کر سکے۔ اس بات سے مسلم اہلِ فکر ہی نہیں بلکہ عوام بھی بخوبی واقف ہیں کہ اسلام میں کسی مذہبی پیشوائی کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی کسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اہلِ زمین کے سامنے خود کو خدا کا نمائندہ یا رسول کے نائب کی حیثیت سے پیش کرے کہ یہاں پوری امت مسلمہ نیابتِ نبوی کے فریضے پر مامور ہے۔ البتہ نظری طور پر کسی مذہبی پیشوائی کے انکار کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے مابین عرصہ ہوا ایک نامحسوس چرچ رفتہ رفتہ وجود میں آتا گیا اور عملاً ہوا یہ کہ قرآن مجید کی تشریح و تعبیر پر طبقۂ علماء نے مختلف حوالے سے اپنا حق محفوظ کر لیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا، اس عمل کو سمجھنے کے لئے ہماری علمی اور تہذیبی تاریخ میں در آنے والے انحرافات کو سمجھنا لازم ہوگا۔ البتہ ہم یہاں صرف چند امور کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے۔

ابتداء میں قرآن مجید کو ایک رہنما کتاب کی حیثیت حاصل تھی جسے ہر خاص و عام اپنے غور و فکر کا مستحق سمجھتا تھا۔ صحرائے عرب کے بادیہ نشینوں کے لئے عربی مبین میں نازل ہونے والی اس کتاب کی حیثیت بیان للناس کی تھی۔ رہی وہ باتیں جن کے بارے میں اس کتاب میں کوئی صریح رہنمائی نہیں پائی جاتی تھیں، تو ان مسائل پر پہلی نسل کے مسلمان انصاف کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی فیصلہ پر پہنچ جاتے تھے۔ بسا اوقات ان فیصلوں میں اختلاف بھی پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں عہدِ رسولؐ اور عہدِ ابوبکر کے بعض فیصلوں پر نظرِ ثانی کی گئی۔ مثال کے طور پر مالِ غنیمت کی تقسیم یا تألیف قلب کے لئے

دی جانی والی رقم کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے اپنے پیش روؤں سے مختلف راستہ اختیار کیا اور اسے وہ بدلے ہوئے حالات میں زیادہ قرینِ انصاف سمجھتے رہے۔ بعض مسائل ایسے بھی تھے جن کی کوئی نظیر عہدِ رسول میں پائی جاتی تھی اور نہ ہی اس قسم کے مسائل ابتدائی خلفاء کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے ان مسائل پر عقل کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ابتدائی عہد میں جب مسلمان کسی مسئلہ پر فیصلہ کرنے کے لئے پچھلی نظیروں کو دیکھتے تھے تو اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ معاشرے میں مروّجہ ان اصولوں سے استفادہ کیا جائے جن میں انصاف کی ضمانت مل سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ 'سنن' کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا تھا یعنی ایک ایسا معروف طریقۂ کار جو معاشرہ میں رائج رہا ہو اور وہ قرینِ انصاف بھی ہو۔ گویا رائے یا عقل کا استعمال ابتدائی ایام میں اہل فکر مسلمانوں کے مابین عقل سلیم کے استعمال سے عبارت تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عقل کا یہ استعمال قرآن مجید کے اس بنیادی فکری ڈھانچہ کے اندر ہی ہوا کرتا تھا۔ البتہ اہل علم اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ جہاں عقل ان کی واضح رہنمائی کرسکتی ہؤا نہی امور کو مزید سند بخشنے کے لئے وہ متقدمین کے اقوال بھی تلاش کریں۔ پہلی صدی کے آخر تک اہل الرائے ہونا تدبر و تفکر کی علامت تھی۔ البتہ دوسری صدی کی ابتداء سے عمر بن عبدالعزیز کی ایماء پر اقوال و آثار کی تدوین نے اس خیال کو تقویت دی کہ مسائل پر قرآنی فریم ورک میں محض عقل کی روشنی میں غور کرنے کے بجائے اگر اقوال و آثارِ رسول اور صحابہ سے بھی مدد لی جائے تو شاید ہمارے فیصلے حق سے زیادہ قریب ہوسکتے ہیں۔ اس خیال نے اہل الرائے کے مقابلہ میں اہل الحدیث کے ایک گروہ کی شناخت قائم کی۔ ثانی الذکر اس خیال کی شدت سے تبلیغ کرتا رہا کہ انسانی عقل کے مقابلہ میں رسول اللہ سے منسوب ایک ضعیف قول کو بھی کہیں زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے کہ آخر یہ ٹھہرا تو قولِ رسول۔ علمائے حدیث پر مشتمل اس گروہ نے اہل الرائے کو اہل الھوی والبدعۃ سے تعبیر کیا۔ دیکھتے دیکھتے تیسری صدی تک مسند امام احمد بن حنبل کے وجود میں آنے کے بعد کوئی چالیس ہزار احادیث پر مشتمل ایک ذخیرہ وجود میں آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوحنیفہؒ جنہیں اہل الرائے کا سرخیل کہا جاتا ہے' ان کے حیطۂ علم میں صرف سترہ حدیثیں ہی آسکی تھیں اور اس لئے وہ مختلف امور میں رائے زنی کے لئے اپنی عقل کو مہمیز کرنے پر مجبور تھے۔

قرآنی دائرۂ فکر میں غور و فکر کے بجائے اقوال و آثار کی تلاش میں لگ جانے سے عملاً ہوا یہ کہ انسانی مسائل پر غور و فکر کرنا اور اس بارے میں کسی قرین انصاف رائے پر پہنچنے کا کام عام انسانوں کے بس سے باہر ہوگیا۔ خدا کی کتاب تو اب بھی موجود تھی لیکن لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا۔ مسلم اہل فکر اب یہ سمجھنے لگے تھے کہ قرآنی الفاظ کی تشریح و تعبیر کی کلید ان اخبار و آثار میں ہے جو لامحدود ہیں اور جن پر اب صرف متخصصین ہی کچھ کہنے کے پوزیشن میں ہیں۔ آگے چل کر لوگوں نے امورِ دین پر لب کشائی کے لئے سخت شرائط عائد کردیں۔ کسی نے کہا کہ فتویٰ دینے کے لئے لازم ہے کہ مفتی کو کم از کم تین لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہوں۔ کسی نے

کہا کہ صرف 'مبسوط' کا زبانی یاد کرنا بھی کسی شخص کو دینی امور میں رہنمائی کے لائق بنا سکتا ہے۔ البتہ ان تمام باتوں میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اب قرآن مجید عام انسانی غور وفکر کے دائرے سے باہر کی چیز سمجھا جانے لگا تھا۔ جب تک اقوال وآثار، تاریخ و تفسیر، ناسخ ومنسوخ جیسے علوم پر قدرت نہ ہو، قرآن مجید سے راست اکتساب ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ اس خیال نے بہت جلد دین اسلام پر متخصصین کی گرفت مضبوط کردی اور یہ خیال عام ہوگیا کہ، بقول شافعی، ان مسائل کی حقیقت اب صرف الراسخون فی العلم کو معلوم تھی۔ رہے عام انسان تو الرسالہ کے مصنف نے انہیں اس بات کا مکلّف قرار نہیں دیا کہ وہ مسائل کی ان باریکیوں کو سمجھنے اور اس بارے میں رائے قائم کرنی کی زحمت گوارہ کریں۔

قرآن مجید جیسا کہ محمد رسول اللہ پر نازل ہوا تھا اپنی اصل حالت میں آج بھی موجود ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت اس کی تلاوت کی اجازت دیتی ہے' تفہیم کی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی خاص مسئلہ کے سلسلہ میں حتمی رائے پر پہونچنے کے لئے اولاً قرآن مجید' ثانیاً آثار واقوال' ثالثاً اجماع اور رابعاً قیاس سے کام لیا جائے۔ حالانکہ قرآن مجید کے متعین متن کے علاوہ تعبیر وشرح کے بقیہ تینوں مآخذ انسانی فہم کے کارفرمائی کے باعث باعثِ نزاع رہے ہیں۔ فقہاء کا باہمی اختلاف احادیث کے سلسلہ میں ان کا مختلف فیہ ہوجانے کی وجہ سے ہے اور ان میں سے ہر ایک کا قیاس جسے مختلف فقہی اصطلاحوں مثلاً مصالح مرسلہ، استحسان جیسے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے' دراصل ان کی اپنی فہم کا ماحصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود تیرہ صدیوں پر مشتمل تعبیری ادب میں ایسی آراء کی کمی نہیں جو ہیں تو نزاعی البتہ ان پر اجماع کے انعقاد کا دعویٰ کیا جاتا رہا ہے۔ کہنے والوں نے یہاں تک کہا' جیسا کہ حنبلی فقیہ ابن عقیل کی رائے ہے' کہ قرآن کے متن کے مقابلہ میں اجماع کہیں زیادہ قابل قبول ہے' اس لئے کہ متن کے بارے میں' بقول ان کے' تو یہ خیال رہ سکتا ہے کہ شاید اس آیت کی تنسیخ کرنے والی کوئی دوسری آیت موجود ہو جب کہ اجماع ناقابل تغیر وتبدل ہے جس کی صحت کے سلسلہ میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اندازِ فکر نے قرآن مجید پر راست غور وفکر کے تمام دروازے بند کردئے ہیں۔ اب ہمارا کام صرف یہی رہ گیا کہ ہم متقدمین کی فہم پر کامل انحصار کریں اور ان کی تعبیری لغزشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ یہ خیال عام ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کا مفہوم اگر اسلاف کی فہم سے الگ ہوجائے تو اسے تفسیر بالرائے پر محمول کیا جائے گا اور راسخ العقیدہ مسلمان اسے قبول کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں گے۔ تو کیا عصر حاضر کے انسانوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں کہ وہ خدا کی اس کتاب کو جو مدت سے بند رکھی گئی ہے ایک بار پھر اسے سنجیدہ مطالعہ اور غور وفکر کا محور بنائیں۔ اس سوال کا اثبات میں جواب دینا حالات میں کسی انقلابی تبدیلی کے بغیر شاید ممکن نہیں۔

ہماری فکری تاریخ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس بات کے قائل رہے ہیں کہ قرآن مجید پر راست غور وفکر کا زمانہ اب ہوا ہوگیا حتیٰ کہ اب وہ اس بات کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ فقہاء کے دواوین کا قرآن کی روشنی میں نقد واحتساب کیا

جائے۔ جب لوگ اس خیال کے قائل ہوں کہ قرآن مجید کی وہ آیتیں جو ہمارے فقہاء کے دواوین سے ٹکراتی ہوں وہ یا تو مؤول یا منسوخ ہیں، تو بھلا وہ اس بات کی کیوں ضرورت محسوس کریں گے کہ وہ اپنی ذاتی یا اجتماعی زندگی میں قرآن مجید کی طرف رجوع کریں۔ طرفہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اہل علم حضرات بھی اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ چار ائمۂ فقہاء کا ظہور اور ان مسالک کی تدوین من جانب اللہ ہے، اس لئے ان سے پیچھا چھڑانے کی کوئی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی۔ رہی یہ بات کہ ان فقہاء عظام کے توسط سے قرآن مجید کا مطالعہ ہمیں عہدِ عباسی میں پیش آنے والے مسائل سے نبرد آزما کرتا ہے اور یہ کہ عصر حاضر کہ مسائل پر رہنمائی کے لئے فقہا کے بجائے قرآن مجید کہیں زیادہ رہنمائی کا سزاوار ہے تو اصولاً اس بات کو قبول کر لینے کے باوجود ہم اس خوف سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں مبادا ہماری ناقص عقل ہمیں ٹھوکر کھانے پر مجبور کردے اور ہم فکری اعتبار سے خود کو ایک بحران میں گھرا پائیں۔ حالانکہ یہ نئی صورتحال کسی بحران کے بجائے ایک ایسی شدید فکری ہلچل پر منتج ہوسکتی ہے جو وحی کی تجلیوں کی بے نقابی سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا ازسرِ نو کھولنا صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے لئے بھی ایک بڑا وقوعہ ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیغمبر کے غیاب میں کتاب کا کھلنا اپنے اندر بڑا اندیشہ رکھتا ہے لیکن اسے کیا کیجئے کہ خدا کی اسکیم یہی ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب انسانی معاشرہ مجموعی طور پر اتنا بالغ ہو چکا ہے جہاں کسی پیغمبر کے غیاب میں بھی وہ وحی ربانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب خدا کوئی نبی نہ بھیجے گا۔ نبی کے غیاب میں خدا کی کتاب حجۃ من بعد الرسل کی حیثیت سے انسانوں کی رہنمائی کا کام انجام دیتی رہے گی۔

اس سے پہلے کہ قرآن مجید کو دنیائے انسانیت کے لئے فی الواقع کھول دیا جائے، اس سوال کو فیصل کر لینے کی ضرورت ہے کہ تشریح وتعبیر کا واقعی حق کسے حاصل ہے؟ طبقۂ علماء کو، اصحاب فقہاء کو، دینی علوم کی دانش گاہوں کو، فقہ کے حوالے سے قائم ہونے والی مجالس کو یا مسلم ریاستوں میں پائی جانے والی ہیئہ کبار علماء اور اوقاف کی وزارتوں کو۔ کیا قرآن مجید جیسا کہ وہ ہے بعینہٖ اسی حالت میں ہماری رہنمائی کرسکتا ہے یا مختلف مسالک کے حاملین کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اسے اپنے مسلک کی روشنی میں پڑھیں اور اسے اپنے موقف کی توثیق کے لئے استعمال کریں۔ مسالک کی باقاعدہ تعمیر کو کوئی گیارہ صدیاں بیت چکیں لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ ان میں واقعی اہل الھوی کون ہیں اور اہل الحدیث کون؟ اہل عدل کون ہیں اور اہل سنت والجماعت ہونے کی سند کسے دی جاسکتی ہے؟ مذہب بنام مسلک جس کی حیثیت دین میں ایک نئے ایجاد کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کا سکّہ پچھلی گیارہ صدیوں سے چلتا رہا ہے۔ پہلی صدی کے آخر تک مذہب کا لفظ مدوّنہ مسلک کے معنوں میں مستعمل ہوتا دِکھائی نہیں دیتا البتہ تیسری صدی کی ابتداء میں اہل علم کے طریقۂ تحلیل وتجزیہ کے طور پر اس کا استعمال عام ہوجاتا ہے۔ لفظ مذہب (ذھب یذھب)

سے ابتدائی عہد میں ایک ایسا طریقۂ فکر یا methodology مراد لیا جاتا تھا جسے مخصوص عالم نے اپنے لئے منتخب کر لیا ہو۔ تب ابو حنیفہ یا مالک کا مذہب کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مسئلہ مذکور میں یہ ان حضرات کی مخصوص رائے ہے اور بس۔ تب کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ آنے والے دنوں میں بعض علماء کا طریقۂ تعبیر عام مسلمانوں کے لئے مذہبی شناخت کی حیثیت حاصل کر لے گا اور مسلم اہل فکر خود کو اس بات پر مجبور پائیں گے کہ وہ اپنے فہمِ قرآن کو اپنے ہی جیسے انسانوں کی فہم کے تابع کریں جس کے بغیر ان کی فہم کو اعتبار نہیں مل سکتا۔ ہماری فکری تاریخ کا یہ کتنا بڑا جبر ہے کہ آج قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود ہم اس سے راست اکتساب کے تمام تر دروازے بند پاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ائمۂ فقہاء کے بغیر ہماری مذہبی زندگی کی مشین ایک لمحہ بھی حرکت نہیں کر سکتی۔ دنیا میں اس سے بڑا شاید ہی کوئی مغالطہ ہو جس نے صدیوں سے عاقل انسانوں کو مسمرائز کر رکھا ہو۔ معاملہ نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا ہو یا مناسکِ حج کی تفصیلات کا۔ فقہ کی کتابوں نے آج تک کس مسئلہ کو فیصل کیا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ عملی طور پر شاید ہی کوئی سلیم العقل مسلمان ہو جو اپنے ائمہ کے ذریعہ متعین کردہ نماز کے تمام فرائض اور سنتوں کو بجا لاتا ہو۔ زکوٰۃ کے نصاب کے سلسلہ میں خود احناف کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ رہے طہارت اور مأکولات کے مسائل، تو اس بارے میں جو چیز ایک کے یہاں ناپسندیدہ ہے وہی دوسرے کے یہاں پسندیدہ بن جاتی ہے۔ ہر مسئلہ پر فقہاء سے پوچھنے کے رویے نے ہمیں اپنے دل و دماغ کے استعمال سے روک دیا ہے۔ جب کوئی فقیہ کنویں کو پاک کرنے کے لئے چالیس ڈول پانی نکالنے کا مشورہ دیتا ہے یا جب کوئی حنفی فقیہ پیشاب لگے کپڑے کو پاک کرنے کے لئے جو خشک ہو گیا ہو، کسی ایک کونے کے دھوڈالنے کا مشورہ دیتا ہے تو وہ کسی آسمانی ہدایت کی روشی میں ایسا نہیں کرتا بلکہ وہ اسی عقل کو استعمال کرتا ہے جو اللہ نے ہر انسان کو دی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان تمام چھوٹے چھوٹے مسائل میں جہاں عقل ہماری رہنمائی کر سکتی ہو، ہم لازماً خود کو دوسرے کا دست نگر بنائیں۔ حرام و حلال کھول کھول کر قرآن مجید میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد زندگی کے تمام مسائل خواہ وہ ہاتھ پر بیٹھی مکھی اڑانے کا معاملہ ہو یا اسے زہریلے چھڑکاؤ سے مارنے کا خیال ہو، یہ سب وہ مسائل ہیں جس پر ہر شخص کو اپنی عقل کا استعمال کرنا چاہئے کہ ایسا نہیں کرنا عقل کے تئیں کفرانِ نعمت ہوگا۔

قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لئے کتابِ ہدایت ہے۔ یہ خیال کہ ماضی میں فقہاء و مفسرین نے اس سے ہدایت کا تمام تر عرق کشید کر لیا ہے اور یہ کہ اب ائمہ فقہاء و مفسرین کے بغیر قرآن کی کوئی فہم قابل اعتبار نہیں ہو سکتی، ایک ایسا خیال ہے جس پر قرآن سے سند نہیں لائی جا سکتی۔ اس کے برعکس قرآن اس خیال کی نکیر کرتا ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو، خواہ وہ احبار و رہبان ہی کیوں نہ ہوں، ارباباً من دون اللہ کے منصب پر فائز کر دے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ بیان للناس ہے، ہدی للمتقین ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید انسانی دل و دماغ سے عبودیت کا فطری آبشار بہانا چاہتی ہے' اس کی توجہ عبودیت پر ہے رسومِ عبودیت پر نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حج کے ایام میں جب بعض صحابہ نے رسول اللہ سے یہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! ان مناسک کی صحیح ترتیب کیا ہے؟ میں نے بعض مناسک پہلے ادا کر لئے اور بعض بعد میں' تو آپ نے برملا کہا کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے کسی بھائی کو تکلیف نہ دے۔ نماز جیسی متواتر عبادت کی ادائیگی میں رفع یدین سے لے کر سلام کے پھیرے جانے تک مسلمانوں میں جو اختلاف چلا آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ابتدائی عہد میں اس بات پر کسی کی توجہ کم ہی جاتی تھی کہ کس نے کہاں ہاتھ باندھ رکھا ہے' کوئی آمین زور سے کہتا ہے یا آہستہ سے' ساری توجہ اس امر پر مرکوز تھی کہ نماز بندے کا خدا سے رشتہ استوار کرتی ہے یا نہیں۔ اسی طرح روزے کے سلسلے میں اوقاتِ طلوع و غروب کے تعین کا کام انسانی اندازے پر چھوڑ دیا گیا۔ سیکنڈ یا منٹ کے حوالے سے کسی باقاعدہ چارٹ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں العفو کی حد بندی کے بجائے اسے انسانی صوابدید اور اندرونی آمادگی پر چھوڑ دیا گیا۔ بتایا گیا کہ جو کچھ آپ کی ضرورت سے زیادہ ہے وہ دراصل آپ کا نہیں۔ ان تمام امور پر جہاں قرآن چاہتا ہے کہ عبودیت کاملہ کا آبشار انسان کے اندرون سے بہے' وہاں فقہ کی مداخلت اسے رسومِ عبودیت میں بدل دیتی ہے۔ یہ کچھ وہی صورتحال ہے جس پر اہل یہود کے حوالے سے قرآن میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب ان سے گائے کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا تو وہ اسے فی الفور کر گزرنے کے بجائے ان فقہی موشگافیوں میں لگ گئے کہ گائی کیسی ہو، اس سے بار برداری کا کام لیا جاتا ہو یا نہیں، اور یہ کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ ﴿لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله التقوىٰ منكم﴾

قرآن مجید کو ازسرنو کھولنے سے پہلے لازم ہے کہ مسلم معاشرے میں پائی جانے والی چرچ جیسی صورتِ حال کا خاتمہ ہو۔ مشکل یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں پایا جانے والا یہ چرچ ایک نامحسوس عمل ہے جو اپنے زبردست اثرات کے باوجود تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی متشکل نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی بیخ کنی کسی لوتھر کے بس کی بات ہے اور نہ ہی کوئی فرد واحد اس چیلنج کو قبول کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا حقیقی مقابلہ صرف وحی ربانی کر سکتی ہے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ ہم تمسک بالکتاب کی راست دعوت دیں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ کتاب کی فہم قدماء کی فہم کے تابع نہیں ہونی چاہئے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم قدماء کی فہم کو کتاب کی روشنی میں ازسرنو تنقید و تجزیہ کا موضوع بنائیں۔ یہ بات میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ متقدمین نے قرآن مجید کو اپنے عہد میں برتنے کے لئے جو منہج تشکیل دیا تھا اس کے اندر صرف اس مخصوص عہد سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس زمانہ میں ان کی یہ تعبیر کہیں زیادہ قرین انصاف ہے۔ ضروری نہیں کہ آنے والے دنوں میں بھی یہی صورتِ حال برقرار رہی ہو۔ مثال کے طور پر جب حضرت عمرؓ نے نص قرآنی کی موجودگی کے باوجود مخصوص حالت میں قطع ید کی حد کو ساقط کر دیا

تو وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ان کا یہ قدم غایت قرآنی سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کے سلسلے میں صریح نص کی موجودگی کے باوجود اس عہد کے مسلمانوں کو خلفاء نے اور بعد کے دنوں میں فقہاء نے ایسی شادیوں سے احتراز کرنے کی ترغیب دی۔ عہد عمر میں ذمیوں کے لئے غیار پہننے کو لازم قرار دینا، انہیں گھوڑے کی سواری سے منع کرنا، یا نئے چرچ کی تعمیر سے روکنا ایسے اقدامات تھے جسے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نافذ کرنا ضروری سمجھا۔ ضروری نہیں کہ آنے والوں دنوں میں یہ صورتِ حال برقرار رہے۔ اسی طرح ﴿ فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث وربع ﴾ جیسی آیت سے اس کے سیاق کے علی الرغم فقہاء نے سماجی انصاف کے قیام کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ شہدا کی بیواؤں کو سہارا دینے کے لئے مسلم معاشرے کے اندر گنجائش پیدا کی جائے۔ ضروری نہیں کہ ایسا کرنا آج بھی سماجی انصاف کی ضمانت دے سکے۔ ﴿ ولو شاء الله لجعلکم امة واحدة و لکن لیبلوکم فی ما آتاکم ﴾ جیسی آیت کے تناظر میں اہل کتاب یا موحدین کے دوسرے گروہوں کی نجات کے سلسلہ میں جو واضح اشارے ملتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ ان الذین آمنوا والذین هادوا والنصٰری والصٰبئین من آمن بالله والیوم الآخر و عمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم لا خوف علیهم ولا هم یحزنون ﴾ ان جیسی آیات کو فقہاء نے آیت سیف کے ذریعہ منسوخ کر رکھا ہے۔ موجودہ سمٹتی دنیا میں جہاں مسلمانوں کے لئے کسی دارالاسلام میں سمٹ کر علیحدہ رہنا ممکن نہیں رہا' جہاں مختلف امتوں کے مابین کلمة سواء کی بنیاد پر مشترکہ پروگرام کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہونے لگی ہے' کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس نئی صورتحال میں قدیم مفسرین کی اس فہم پر اصرار کریں کہ ﴿غیر المغضوب علیهم ولا الضالین﴾ سے بالترتیب یہود ونصاریٰ مراد ہیں۔ نئی بدلی ہوئی صورتِ حال میں قرآن مجید کے صفحات پلٹنے اور اس سے اکتساب ہدایت کا واضح مطلب ہوگا کہ ہم ذہنی طور پر اس بات کے لئے آمادہ ہوں کہ ہمارا فہم قرآن ہمیں قدما سے الگ راستہ کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ اس نفسیاتی جھٹکے کے لئے ہم جب تک تیار نہیں ہوں گے قرآن کھولنے کے ہمارے تمام دعوے اس پر مزید قفل چڑھانے کے مترادف ہوں گے۔